التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

ڈاکٹر شاکر حسین خان

Justice Peer Mohammad Karam Shah Al-Azhari was an uncontroversial, literary, spiritual man and a true leader of Muslims. He performed religious and national services on national and international level. This article is not simply based on his exaltation while it is rather a research work on him.

Peer Sahab was thought Hashmi by his believers but according to my research he was Qurashi. His duration of stay in Egypt is cited different and his tenure of judiciary is stated differently but I have a different view. His judicial decisions are told in dozens but to me his total judicial decisions are not more than a dozen. I have proved it with concrete arguments that Peer Sahab was a great literary and spiritual peronality. He was a true invitee of unity of Ummah. There is no contradiction in his sayings and acts. His thoughts and philosophy is valued to be followed.

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری المعروف ضیاء الامت کی شخصیت علمی، دینی اور روحانی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۶ ہجری بمطابق یکم جولائی ۱۹۱۸ء شب دوشنبہ (پیر) بعد از صلوۃ التراویح (۱) بھیرہ، ضلع سرگودھا میں قریشی خاندان کے مذہبی گھرانے میں تولد ہوئے پیر صاحب کا سلسلہ نسب شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہوتا ہوا صحابی رسول محترم ہبار (ابن الاسود بن مطلب بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصیٰ) سے جاملتا ہے۔(۲)

شیخ ملتانی کے آباؤ اجداد عربی النسل اور خاندان قریش سے تھے بعض سوانح نگاروں نے شیخ ملتانی کو ہاشمی تصور کیا ہے "آپ ہاشمی ہیں اور ہاشمی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں"(۳) یہ تصور غلط فہمی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے یہی نہیں بلکہ "پنجاب چیف اور پنجاب گزیٹر (Gazetteer) ملتان ڈسٹرکٹ اور کنگھم کی رپورٹ میں حضرت بہاء الحق کو اسدی الہاشمی ظاہر کیا گیا ہے محمد شاہ اور نادر شاہ کے ایک مشترکہ اعلانیہ میں جس پر ۱۱۵۷ء کی تاریخ ثبت ہے اس میں بھی آپ کو اسدی الہاشمی تسلیم کیا گیا ہے"(۴)

شیخ ملتانی کو ہاشمی تصور کرنا محبت وعقیدت پر مبنی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ "پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور نے اپنے مقالہ "الشیخ الکبیر بہاء الدین زکریا ملتانی" میں بھی آپ کو اسدی ہاشمی تسلیم کیا ہے"(۵)

راقم کے نزدیک ہاشمی صرف وہی ہے جو جناب عبدالمطلب بن ہاشم کی اولاد سے ہو۔ "ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "المعارف" میں لکھا ہے کہ عبدالمطلب کی اولاد کے سوا دنیا میں کوئی ہاشمی نہیں عبدالمطلب بن ہاشم سے ہاشمی نسل چلی، ہاشم کے باقی بیٹے مقطوع النسل تھے، یہی نظریہ "تاریخ الخمیس" اور روضۃ الاحباب" کا بھی ہے۔(۶)

ابن حجر عسقلانی نے اپنی تصنیف (۷) میں پانچ ایسے اشخاص کا تذکرہ کیا ہے جن کے نام ہبار ہیں وہ یہ ہیں:
۱۔ہبار بن الاسود ۲۔ہبار بن سفیان ۳۔ہبار بن صیفی
۴۔ہبار بن ابی العاص ۵۔ہبار بن وہب

ان تمام صاحبان کا تعلق حضرت عبدالمطلب بن ہاشم سے نہیں اس لیے ان میں سے کوئی بھی ہبار ہاشمی نہیں۔ شیخ ملتانی کا شجرہ نسب حضرت ہبار بن الاسود بن الاسد بن عبدالعزیٰ بن قصی سے جاملتا ہے اس لیے شیخ ملتانی قریشی الاسدی ہیں۔ الاسدی الہاشمی نہیں، حضرت ہبار کا تعلق اسد بن عبدالعزیٰ سے ہے اسد بن ہاشم سے نہیں۔ اسد بن ہاشم کی صرف ایک بیٹی تھی ان کا نام فاطمہ بنت اسد ہے جوکہ جناب علی بن ابی طالب کی والدہ ہیں۔ تحریر کردہ دلائل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ شیخ ملتانی قریشی ہیں اور پیر کرم شاہ شیخ ملتانی کی اولاد سے ہیں۔ غلط فہمی کی بناء پر ہی پیر صاحب کو بھی ہاشمی لکھا اور پکارا گیا جو غیر صحیح ہے۔

پیر صاحب کا نام "محمد کرم شاہ" ان کے دادا، پیر امیر شاہ (متوفی ۱۳۲۶ھ) نے تجویز کیا تھا۔ نام رکھنے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی کہ "پیر کھارا کوہستان نمک کے دامن میں ایک گاؤں ہے جو "پیر کرم شاہ" المعروف ٹوپی والے" کے فیض کی وجہ سے مرجع خلائق ہے اس ہستی کے ساتھ ان کے خانوادہ کی رشتہ داری بھی ہے اس لیے آپ کے جد امجد نے انہی کی نسبت سے آپ کا نام محمد کرم شاہ رکھا۔(۸)

خاندان کی روایت کے مطابق تعلیم کا آغاز قرآن کریم سے ہوا۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم، محمدیہ غوثیہ پرائمری اسکول سے حاصل کی جس کو ان کے والد پیر محمد شاہ (متوفی ۱۹۵۷عیسوی) نے ۱۹۲۵ء میں قائم کیا تھا۔ پیر صاحب اس اسکول کے پہلے طالب علم تھے اس وقت ان کی عمر سات سال تھی۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ سے میٹرک کیا۔(۹) پیر صاحب اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنے والد کے قائم کردہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ (قائم شدہ ۱۹۲۵ء) بھیرہ میں دینی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔(۱۰)

فاضل عربی کے لیے انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور

امتحان ۶۰۰ میں سے ۵۱۲ نمبر لیکر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پورے پنجاب میں پہلی پوزیشن حاصل کی پھر ضلع ہزارہ کے شہر مانسرہ پہنچے اور وہاں مولانا حمید الدین سے اصول فقہ کے اسباق پڑھے۔(۱۱)

۱۹۴۲ء میں دورہ حدیث کے لیے مرادآباد گئے جہاں انہوں نے سید نعیم الدین مرادآبادی سے دورہ حدیث کی چند کتابیں پڑھیں باقی کتابیں مولانا محمد عمر (والد مفتی اطہر نعیمی) سے پڑھیں۔ تکمیل ہوئی تو دیوان آل رسول سید اجمیری نے دستار باندھی۔ سند دیتے ہوئے علامہ مرادآبادی نے کہا "میں آج مطمئن ہوں کہ میرے پاس دینی علوم اور حدیث طیبہ کی جو امانت تھی وہ میں نے موزوں فرد تک پہنچادی۔(۱۲)

پیر صاحب نے مرادآباد سے آنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا(۱۳) ۱۹۴۸ء میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔(۱۴) ان کا نکاح سجادہ نشین آستانہ عالیہ سیال شریف قمرالدین سیالوی نے پڑھایا۔

پیر صاحب کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے جامعہ ازہر (مصر) جائے چناں چہ وہ مئی ۱۹۵۱ء میں جامعہ ازہر مصر چلے گئے۔(۱۵) جہاں انہوں نے تین سال دوماہ (جون ۱۹۵۱ تا جولائی ۱۹۵۴ء) قیام کیا۔ ان کے بعض مدح سراؤں نے قیام مصر کا دورانیہ بیان کرنے میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ درست وہی ہے جو راقم نے تحریر کیا ہے۔ پیر صاحب نے جامعہ قاہرہ میں بھی داخلہ لیا تھا۔(۱۶) اور شام کے اوقات میں جامعہ فواد بھی لیکچر سننے جاتے تھے(۱۷) پیر صاحب اپنی تحریرات ومکتوبات میں اپنے آپ کو ایم۔اے جامعہ ازہر ہی ظاہر کرتے تھے۔ پیر صاحب کا یہ طریقہ رہا کہ جہاں فرصت ہوئی وہاں کچھ نہ کچھ سیکھ لیا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے مختلف دیہات اور شہروں کا دورہ کیا اور وہاں کے علماء سے درس لیا یہی طریقہ انہوں نے مصر میں بھی جاری رکھا۔

پیر صاحب نے قیام مصر کے دوران تصانیف وتالیف کا بھی آغاز کردیا تھا۔ بیان سرفروشی اور سنت خیرالانام، اسی دور میں تحریر کیں۔ وہ ڈائری بھی لکھتے تھے ان کی ڈائری میں روز مرہ کے معمولات اور اس وقت کے حالات وواقعات پر تبصرے موجود ہیں(۱۸) پیر صاحب نے

جامعہ ازہر میں ایم۔اے کرنے کے بعد جامعہ کے شعبہ تخصص فی القضاء میں ایم۔فل/پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرائی تھی۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''الحدود فی الاسلام'' تھا اور وہ یہ تحقیقی کام ڈاکٹر ایوب علی آف بنگلہ دیش کی زیرِ نگرانی کر رہے تھے۔(۱۹) لیکن ان کا یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر وطن واپس آ گئے۔ راقم نے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے حوالے سے حافظ احمد بخش سے بذریعہ مکتوب دریافت کیا کہ پیر صاحب کا مقالہ ایم۔فل/پی ایچ ڈی کہاں ہے؟(۲۰) اس کے جواب میں انہوں نے اپنے مکتوب میں رقم کیا کہ ''قبلہ پیر صاحب کے مقالہ کا اکثر مواد مصر میں ہی رہ گیا تھا۔ مزید اس کے بارے میں پتہ نہیں''(۲۱)

پیر صاحب وطن واپس آنے کے بعد اپنے والد کی تیمارداری میں لگ گئے۔ کچھ وقت ملتا تو دارالعلوم میں زیرِ تعلیم طلبہ کو اسباق پڑھاتے یا اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جس دن ان کے والد کا چہلم تھا اس دن انہوں نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز کیا۔(۲۲) اور ایسا نصاب متعارف کرایا جو قدیم و جدید علوم کا حسین امتزاج تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں باقاعدہ طور پر اپنی فہم و فراست سے دینی مدارس (اہلسنت) کے لیے عصری تقاضوں کے مطابق دس سالہ نصاب ترتیب دیا۔ اس نصاب میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم منطق، علم الکلام، علم بلاغت، علم صرف، علم نحو کے ساتھ جدید علوم، انگریزی لٹریچر، علم سیاسیات اور علم اقتصادیات کو خصوصی اہمیت دی۔ اس کے علاوہ مختلف بورڈز سے اپنے دارالعلوم کے طالب علموں کو انٹرمیڈیٹ، بی اے اور مختلف مضامین میں ایم۔اے کا امتحان دلوانے کا اہتمام کیا اس کے علاوہ ان کے دارالعلوم کے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم مختلف اسکالرشپ کے تحت مزید تحصیلِ علم کے لیے بیرونی ممالک جانے لگے۔ انہوں نے اپنے دارالعلوم میں تعلیمی ترقی کے ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی اہتمام کیا۔

پیر صاحب ایک طرف تو دارالعلوم کے مہتمم تھے اور دوسری جانب روحانی پیشوا بھی۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم و تربیت و اصلاحِ ملت کے لیے دونوں مناصب کا استعمال کیا۔ انہوں نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کی ڈگر پر ملک کے متعدد شہروں اور قصبوں میں مختلف ناموں سے دینی

جامعات قائم کیں۔ ان جامعات سے فارغ التحصیل علماء ملک کے مختلف حصوں اور دنیا کے متعدد ممالک میں دین کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

پیر صاحب نے روحانی پلیٹ فارم سے بھی اپنی خدمات پیش کیں اور خانقاہی نظام میں اصطلاحات نافذ کیں انہوں نے اپنی خانقاہ سے منسلک افراد کی دینی، روحانی اور معاشرتی سطح پر اصلاح کی کوشش کی، انہوں نے اپنے احباب کو تمام متعلقین کی فہرست تیار کرنے کا مشورہ دیا انہوں نے اپنی خانقاہ سے منسلک افراد کی توجہ اجتماعی مفادات کے حصول کی جانب مبذول کرائی، انہوں نے اپنے اصلاحی مشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اگر ان لوگوں کی اصلاح میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی تو پھر عام وسعت دی جا سکتی ہے۔(۲۳)

انہوں نے اپنا پلان بتاتے ہوئے کہا کہ ''مندرجہ ذیل پہلو خصوصی اہتمام کے مستحق ہیں: ۱۔صحیح عقائد　۲۔اخلاق حسنہ　۳۔تعلیم　۴۔معاشی حالت　۵۔صحت بدنی(۲۴)

ہمارے مذہبی مدارس میں اسلام کے بنیادی عقائد پر کم اور مخصوص نظریات و فروعی اختلافات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، تعلیم صرف اسناد کے حصول کے لیے رہ گئی ہے اس کا عمل سے تعلق منقطع ہو گیا ہے، پاکستانی معاشرے میں انفرادی طور پر معاش کی فکر کی جاتی ہے لیکن اجتماعی فکر کی ضرورت ہے لوگ اپنے ماتحتوں کو بھول جاتے ہیں پھر بھی چند لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فضل و کرم میں دوسروں کو بھی شامل کر لیتے ہیں جس سے ضرورت مندوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔

ہمارے مذہبی اور عصری تعلیمی اداروں میں اخلاق حسنہ پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی اور نہ ہی بچوں کے سرپرست اخلاق و آداب سکھاتے ہیں اسلام میں تعلیم کی پہلی سیڑھی ادب و احترام ہے ایک روایت میں ہے کہ ''پہلے ادب سیکھو پھر علم حاصل کرو''۔ جہاں تک صحت کی بات ہے تو اس معاملے میں نہ تو حکومتی سطح پر کوئی خاص اہتمام کیا جاتا ہے نہ تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے اور نہ ہی والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی صحت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ یقیناً پیر صاحب کی یہ فکر قابلِ داد ہے۔

پیر صاحب مزید کہتے ہیں کہ ''اپنے تمام پیر بھائیوں کو نماز کا ترجمہ، عقائد اور اخلاق

سے متعلق چار مختلف مختصر آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ اور متن یاد کرانا چاہیے تاکہ وہ عملی زندگی ان کی ہدایت اور ان کی روشنی میں گزار سکیں۔ جمعوں کے خطبوں میں بھی یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ حاضرین کو ہر بار کوئی مختصر سی آیت یا حدیث جس کا تعلق عملی زندگی سے ہو یاد کرانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ جب اٹھیں تو کچھ ٹھوس چیز لے کر اٹھیں۔(۲۵) ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیر صاحب نے ایک منصوبہ بندی کے تحت دینی، مذہبی اور معاشرتی خدمات سرانجام دینے کا آغاز کیا۔ وہ اپنی مہم میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے ان کی یہ مہم پاکستان تک محدود نہ رہی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ان کے نمائندوں نے جزوی طور پر اس مہم کو فعال بنانے کی کوشش کی۔ ان کے ادارے کے تحت مختلف سماجی تنظیمیں فلاحی کاموں میں مصروف ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر خانقاہوں سے بھی اس طرح کی اصلاحی تحریکوں کا آغاز کیا جائے تاکہ قومی سطح پر غربت، ناخواندگی، بد اخلاقی اور بے راہ روی پر قابو پایا جا سکے۔

پیر صاحب نے چند پیر صاحبان سے درخواست کی تھی کہ وہ سجادہ نشینوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیں تاکہ ان کی سعی سے خانقاہی نظام پر جو بدنما داغ لگے ہوئے ہیں وہ صاف ہو جائیں پیر صاحب خانقاہی نظام کی اصلاح کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار وقتاً فوقتاً کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ پیر کا لفظ لکھتے تھے وہ کہتے تھے "جب میں اپنے نام کے ساتھ "پیر" کا لفظ لکھتا ہوں تو محسوس یہ کرتا ہوں کہ مجھے اپنے قلم سے اپنے نام کے ساتھ یہ نہیں لکھنا چاہیے اس طرح اس میں یک گونہ ذاتی ستائش کا پہلو نکلتا ہے لیکن پھر بھی صرف اس لیے لکھنے پر مواظبت اختیار کرتا ہوں تاکہ لوگوں کو یقین حاصل ہو جائے کہ پیر بھی عالم دین ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دین کا عظیم تر ین عالم ہونا ہی پیری کی بنیاد ہے"(۲۶)

پیر صاحب کا تعلق سلسلہ چشتیہ سے تھا اس سلسلے میں محفل سماع کا انعقاد بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے محفل سماع کے انعقاد میں علماء کا اختلاف ہے بعض جائز سمجھتے ہیں بعض چند شرائط کے ساتھ جائز سمجھتے ہیں اور بعض جائز نہیں سمجھتے۔ سلسلہ چشتیہ میں مروج قوالی میں آلات موسیقی استعمال ہوتے ہیں ذخیرہ حدیث میں ہمیں دو طرح کی روایات ملتی ہیں ان میں ایک قسم ان روایات کی ہے جو آلات موسیقی کے استعمال کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں اور دوسری قسم ان

روایات کی ہے جن میں آلات موسیقی کے استعمال کو ممنوع سمجھا گیا ہے۔ پیر صاحب سماع مع مزامیر کو جائز سمجھتے تھے۔ حافظ احمد بخش نے راقم کو ٹیلیفون پر بتایا کہ "حضور ضیاء الامت علیہ الرحمہ سماع میں مزامیر کے قائل تھے لیکن وہ بغیر ساز کے سماعت فرماتے تھے"(۴۷) پیر صاحب نے سورہ لقمان کی آیت نمبر ۶ کے تحت لکھا ہے کہ "ہر غنا حرام نہیں بلکہ بعض ایسے مقامات بھی ہیں جہاں اس کی اباحت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے(۴۸)

پیر صاحب ایک بڑے قلم کار اور لکھاری بھی تھے، انہوں نے دینی صحافت میں بھی نام پیدا کیا، انہوں نے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ ضیائے حرم لاہور کا اجراء کیا جو آج تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے، اس کے ادارے "سر دلبراں" کو پذیرائی حاصل ہوئی جس میں انہوں نے پاکستان کے سیاسی، مذہبی معاشرتی اور معاشی تجزیے کئے اس میں پیر صاحب کے کئی علمی تحقیقی اور معلوماتی مضامین شائع ہوئے اس پرچے کے متعدد خاص نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں۔

پیر صاحب، صاحب تصانیف بھی تھے ان کی تصانیف میں سب سے مشہور تفسیر ضیاء القرآن (مکمل پانچ جلدیں) ہے مذکور تفسیر عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور عہد دوراں کی عمدہ و معیاری اردو تفاسیر میں سے ایک ہے پیر صاحب نے قرآن کریم کا مکمل اردو ترجمہ بھی کیا اگرچہ وہ تفسیر قرآن کا حصہ ہے لیکن اسے "جمال القرآن" کے نام سے الگ بھی شائع کیا گیا ہے۔ پیر صاحب نے قرآن کریم کی بعض آیتوں کا منفرد ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ضیاء النبی (مکمل سات جلدیں) بھی ادبی شاہکار ہے ان کی اس کاوش پر حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر نے صدارتی ایوارڈ بھی دیا۔ ان کی دیگر علمی کاوشوں میں سنت خیر الانام، مقالات (دو جلدیں) مرتب حافظ احمد بخش، خطبات (مرتب خلیفہ ملک مختار احمد مجاہد)، ملفوظات (مرتب محمد اکرم ساجد)، مکاتب (مرتب محمد اعجاز احمد کوندل)، ترجمہ و شرح قصیدہ اطیب النغم، مجموعہ وظائف اور دیگر بڑی چھوٹی کتب، رسائل اور مختلف نوعیت کے مضامین شامل ہیں ان کی شخصیت جس صداقت سے عبارت تھی اس کا اظہار ان کی تحریرات میں نمایاں نظر آتا ہے۔

محمد کرم شاہ ان دو میں سے ایک تھے جن کے بارے میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سابق

صدر جنرل محمد ضیاء الحق (ش۔ ۱۷/اگست ۱۹۸۸ء) نے کہا تھا کہ ''انہیں سونے میں تولا جاسکتا ہے'' جنرل ضیاء ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہیں ۱۹۸۰ء میں ستارہ امتیاز کا ایوارڈ پیش کیا اور جون ۱۹۸۱ء میں انہیں وفاقی شرعی عدالت کا جسٹس مقرر کیا۔

جسٹس (ر) امجد علی سابق جوائنٹ سیکریٹری وزارت قانون رقم طراز ہیں: ''حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ کی تقرری جنرل ضیاء الحق نے کی آپ علماء ججز کے پینل میں فیڈرل شریعت کورٹ میں (جو پہلے شریعت بنچ تھا) آئے پیر صاحب کا چونکہ دینی علم ومطالعہ بڑا وسیع تھا لہذا قصاص ودیت کا قانون بنانے کے لیے پیر صاحب سے راہنمائی لی گئی۔ اس قانون کے کئی پیچیدہ گوشے تھے جنہیں حل کرنے کے لیے ہماری بحثیں ہوتی تھیں۔ تاہم قصاص ودیت کو قانونی حیثیت دینے میں پیر صاحب کا کافی حصہ ہے ہم تمام دینی پہلوؤں کے حوالے سے آپ سے ہی راہنمائی حاصل کرتے تھے پیر صاحب کے علم کی انتہا نہیں تھی میں خود بے شمار دینی معاملات میں آپ سے مستفیض ہوا'' (۲۹)

پیر صاحب عدالتی مناصب (۳۰) پر زیادہ سے زیادہ سترہ سال ایک ماہ تک فائز رہے(۳۱) اس عرصے کے دوران انہوں نے متعدد فیصلے کیے جو پاکستانی عدالتی وقانونی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان کے ان تاریخی عدالتی فیصلوں کی روشنی میں وزارت قانون حکومت پاکستان نے آئین پاکستان سے چند ایک دفعات پیر صاحب کی تحقیق یا علم یا نظریے کے مطابق غیر اسلامی تھیں حذف کیں۔ حافظ احمد بخش ان فیصلوں کے عنوانات کی فہرست بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں ''حد رجم، قانون شفعہ، زرعی اصلاحات، جبری ریٹائرمنٹ، قبضہ مخالفہ، انعامی بانڈز، صنعت فلم سازی، شناختی کارڈ کے لیے تصاویر اور ان جیسے درجنوں موضوعات ہیں جن پر آپ کے فیصلے پاکستانی عدلیہ کے لیے روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۳۲)

حافظ صاحب کی دیگر درجنوں موضوعات سے کیا مراد ہے؟ ہمیں اس کے بارے میں آگہی حاصل نہ ہوسکی البتہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز نے مارچ ۲۰۰۳ء میں ''ضیاء الامت کے عدالتی فیصلے'' کے عنوان سے ۲۱۸ صفحات پر مشتمل کتاب کی اشاعت کی، مذکورہ کتاب سے بھی صرف انہیں چند عنوانات کے نام معلوم ہوسکے جن کی تعداد ایک درجن بھی نہیں۔ ہماری رسائی ان گزیٹر

(Gazetteer) تک نہ ہوسکی جن کے بارے میں جنرل محمد ضیاء الحق نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وفاقی شرعی عدالت کے دیئے گئے فیصلوں کو گزیٹر کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔(۳۳)

پیر صاحب کے عدالتی فیصلوں کا جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے عموماً فقہ حنفی کی روشنی میں اپنے فیصلے رقم کیے۔ جدید مسائل کے حل کے لیے اجتہاد سے بھی کام لیا جو جزوی تھا۔ انہوں نے مسائل کے حل کے لیے قرآنی آیات سے استدلال کیا کہیں کہیں ایسی حدیثی روایات کی نشاندہی بھی کی جو غیر صحیح ہیں۔ اکثر ایسی حدیثوں پر اعتماد کیا جو فقہ حنفی کے عین مطابق ہیں ان کی عدالتی وفقہی خدمات کا محور فقہ حنفی کی تعلیمات رہا۔ طلاق ثلاثہ کے مسئلہ میں انہوں نے قدیم علمائے احناف سے اختلاف بھی کیا ہے۔(۳۴)

پیر صاحب کی علمی وملی خدمات کا دائرہ پاکستان تک محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے عالمی سطح پر دین کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا، انہوں نے اپنے اخلاق وکردار سے قوم وملت کا سر فخر سے بلند کیا اسلام اور پاکستان کا نام روشن کیا، اس سلسلے میں انہوں نے متعدد ممالک کے سرکاری وغیر سرکاری دورے کیے۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء میں جمعیت علمائے پاکستان (JUP) کی جانب سے مولانا شاہ احمد نورانی (متوفی ۱۱/دسمبر ۲۰۰۳ء) کے ہمراہ ڈھاکہ کا دورہ کرکے وہاں کے حالات کا جائزہ لیا اور ملک کے خلاف ہونے والی سازشوں سے حکومت پاکستان کو آگاہ کیا۔(۳۵)

۳/جون، ۱۹۷۹ء کو وفاقی وزیر داخلہ کے ہمراہ روس جاکر وہاں کے مسلمانوں کے حالات کا مشاہدہ کیا اور وہاں کے مقامی علماء سے ملاقات کی۔(۳۶)

اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل محمد ضیاء الحق کی خواہش پر ہیومن رائٹس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جنیوا گئے اور مرزائیوں کے متعلق حکومت پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کی۔(۳۷) پیر صاحب کی حکمت عملی اور دوراندیشی کے باعث قادیانی جو اس وقت عالمی سطح پر پاکستان کو بدنام کرنے کی سازش کررہے تھے ناکام ہوگئے۔ پیر صاحب مہم میں کامیاب ہوئے لیکن انہیں اس مشن پر بھیجنے والا ایک فضائی حادثے کا شکار ہوگیا۔ یقیناً جنرل ضیاء کا جنیوا کے لیے پیر صاحب کا انتخاب کرنا راقم کی نظر میں ضیاء صاحب کی بڑی نیکی ہے۔

پیر صاحب کئی مرتبہ مصر بھی گئے جب وہ ۹/ مارچ ۱۹۹۳ء میں چھٹی مرتبہ مصر پہنچے تو وہاں کے صدر حسنی مبارک نے انہیں نوط امتیاز کا اعزاز پیش کیا یہ اعزاز انہیں ان کی دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دیا گیا۔(۳۸) وہ کئی مرتبہ تبلیغی مہم پر امریکہ بھی گئے تھے جب دوسری مرتبہ ۱۹۹۳ء میں امریکہ پہنچے تو نیوجرسی کے میئر نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا اور اپنے روایت کے مطابق شہر کی چابی بطور اعزاز ان کی خدمت میں پیش کی اور ساتھ ہی قرآن کریم کی تفسیر اور دیگر دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی طرف سے انہیں اعتراف عظمت کا سر ٹیفکیٹ پیش کیا۔(۳۹) یہ مسلمانوں اور بالخصوص پاکستانیوں کے لیے باعث افتخار اور اعزاز کی بات ہے کہ نیوجرسی کے میئر نے ایک پاکستانی اسلامک اسکالر کو ان اعزازات سے نوازا۔

پیر صاحب علم دوست، دین کے علم بردار، بریلوی مسلک کے اعتدال پسند عالم، روشن خیال انسان، اتحاد بین المسلمین کے داعی اور فرقہ واریت کے مخالف تھے۔ انہوں نے کبھی کسی مسلمان کی تکفیر نہیں کی اسی وجہ سے بعض علماء نے ان سے اختلاف کیا اور ان کی اس روش سے خفا بھی ہوئے اور اپنی ناراضگی کا اظہار تحریر وتقریر کی صورت میں کیا ان کے بعض ہم عصر مذہبی رہنماؤں کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ ایک دوسرے کو کافر ومشرک قرار دیتے تھے لیکن پیر صاحب مذہبی انتہا پسندی سے سیکڑوں میل دور تھے یہی وجہ ہے کہ مختلف مسالک کے روشن خیال علماء انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں عالم اسلام کا فرد سمجھتے تھے۔

پیر صاحب کا یہ طریقہ رہا کہ اپنے بزرگوں کے ساتھ دیگر مسالک کے اکابرین کا بھی ادب واحترام کرتے تھے ان کی نظر میں اپنے اور پرائے کے درمیان تفریق نہ تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریرات میں علامہ، مولانا جیسے القاب ہر مسلک کے علماء کے لیے پائے جاتے ہیں وہ اپنے مخالفوں سے بھی حسن اخلاق سے پیش آتے تھے وہ اختلافی مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرتے اپنا موقف بیان کرنے میں شدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ دوسرے کی رائے کا احترام کرتے ہوئے حتی الامکان کوشش کرتے کہ اختلافی مسائل میں وہ راہ اختیار کی جائے جس کو اختیار کرنے سے اختلاف ختم ہوجائے اور کسی قسم کی رنجش باقی نہ رہے ان کی شخصیت پر ہمیشہ

التفسیر
جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

جمالی رنگ غالب رہا جلالی رنگ ان کی طبیعت اور فکر دونوں سے موافقت نہیں رکھتا تھا۔ پیر صاحب نے کسی کتاب کے مصنف اور نہ ہی قرآن کریم کا ترجمہ کرنے والے کسی مترجم پر کفر کا فتوٰی لگایا بعض حضرات نے ان پر مسلکی رنگ جمانے کی کوشش کی اور اپنے مخالفین کے لیے پیر صاحب کی جانب سے ایسے جملے منسوب کیے جو ان کی فکر ونظر اور علم وعمل سے لگا نہیں کھاتے۔ محمد عبدالحکیم شرف قادری نے لکھا ہے کہ ''کسی نے پیر صاحب سے کہا کہ حسام الحرمین میں جن گستاخوں کے بارے میں فتوٰی ہے آپ نے ان پر کفر کا فتوٰی نہیں لگایا، پیر صاحب نے کہا ٹھیک ہے تاہم میں یہ کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا حشر ابوجہل اور ابولہب کے ساتھ ہوگا''(۴۰)

محمد اکرم ساجد فاضل دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ(۴۱) پیر صاحب کا قول نقل کرتے ہیں کہ پیر صاحب نے فرمایا کہ ''کسی کو گستاخ رسول کہنے کا دور گزر گیا'' (۴۲) کسی حد تک یہ بات درست ہے۔ عصر حاضر میں جس کو دیکھو سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اس طرح کی باتوں کو شہ دیتا ہے اور اپنے مخالفین کے لیے اس طرح کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔

ماضی میں دوسروں کے اکابرین کی تذلیل کا دوسرا طریقہ یہ رائج تھا کہ ان کے بچپن کے واقعات اور نادانی کے قصوں کو نہایت ہی قبیح انداز میں بیان کیا جاتا تھا، اس تناظر میں پیر صاحب کا یہ قول ملاحظہ کیجئے ''اس سے بڑھ کر بے انصافی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص کے طالب علمی کے زمانے کی کوتاہیاں بیان کرکے اس کی علمی بزرگی اور اخلاقی فضیلت پر زبان طعن دراز کی جائے''(۴۳) الغرض پیر صاحب نے ہر اس طرز عمل کی مذمت کی جو ملت اسلامیہ میں افتراق وانتشار کا سبب بنتا ہو۔ جب بھی پاکستانی مسلمانوں نے اتحاد کی ضرورت محسوس کی پیر صاحب ان کی کوشش میں کسی سے پیچھے نظر نہیں آئے، تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء اور تحریک نظام مصطفیٰ ۱۹۷۷ء میں قوم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئی تو پیر صاحب نے اس اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، فروری ۱۹۷۶ء کے اداریے صفحہ سر دلبراں میں پائیدار اتحاد کے لیے اپنا پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا۔ وہ کسی بھی اتحاد کی ناکامی سے ناامید نہیں ہوئے بلکہ وہ اتحاد امت کے لیے سعی کرتے رہے۔

انہوں نے ملت اسلامیہ کے اتحاد کا مرکز ومحور قرآن کریم کو قرار دیا ہے اور حقیقت بھی

بھی ہے کہ ملت اسلامیہ کا باہمی اتحاد اگر کسی بات پر ہوسکتا ہے تو وہ قرآن کریم ہی ہے، اقامت فی الدین قرآن کریم کے بغیر ممکن نہیں چنانچہ مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ تمام مسلکی تعصبات سے بالاتر ہوکر قرآنی تعلیمات پر عمل کریں پیر صاحب نے حبل کا معنی ومفہوم تحریر کرتے ہوئے رقم کیا ہے کہ ''حبل اللہ کی رسی سے مراد قرآن کریم ہے'' (۴۴) جب تمام مسلمان اللہ کی رسی یعنی قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے تو منتشر نہیں ہونگے۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا ذریعہ صرف اور صرف قرآن کریم ہے وہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے تحت رقم طراز ہیں:

''اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متحد ہونے کا بھی حکم دیا ہے اور ان کے لیے وہ مستحکم بنیاد مقرر فرمائی جس سے مستحکم تر کوئی اور بنیاد نہیں ہوسکتی اور وہ قرآن کریم ہے'' (۴۵) تمام مسلمان اللہ کی رسی یعنی قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے تو آپس میں منتشر نہیں ہونگے، مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ حدیثی روایات کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں ایسی حدیثی روایات کے پرچار پر پابندی عائد کی تھی جو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا سبب بنتی ہیں۔ (۴۶)

پیر صاحب نے اہلسنت وجماعت کے دونوں مکاتب فکر کے باہمی اختلاف پر بھی افسوس کا اظہار کیا جن کے باہمی اختلاف کے نہایت بھیانک نتائج برآمد ہوئے سیکڑوں کی تعداد میں جانیں ضائع ہوئیں اسلام دشمن عناصر نے ان کے اختلاف سے فائدہ اٹھایا اور ان کے لڑائی جھگڑوں کے سبب مساجد ومدارس کا تقدس پامال ہوا کئی مساجد کی صفیں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئیں متعدد مساجد میں تالے ڈال کر انہیں سیل کردیا گیا جس کے سبب اذان ونماز موقوف کردی گئی، دیوبندی، بریلوی دونوں مکاتب فکر کی جانب سے اختلافی کتابوں، کتابچوں اور اشتہارات کی اشاعت ہوئی ایک دوسرے کے خلاف تقاریر کی جاتی رہیں ایک دوسرے پر کفر وشرک کے فتوے لگائے گئے۔

پیر صاحب نے اہلسنت کے ان دونوں مکاتب فکر کے اختلافات ختم کرنے کے لیے خصوصی طور پر کوششیں کیں جو یقینیاً سودمند ثابت ہوئیں وہ ان مکاتب فکر کے باہمی اختلافات

کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اس باہمی اور داخلی انتشار کا سب سے المناک پہلوں اہل السنۃ والجماعۃ کا آپس میں اختلاف ہے جس نے انہیں دوگروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ دین کے اصولی مسائل میں دونوں متفق ہیں اللہ تعالیٰ کی توحید ذاتی وصفاتی، حضور نبی کریم ﷺ کی رسالت اور ختم نبوت، قرآن کریم، قیامت اور دیگر ضروریات دین میں کلی موافقت ہے لیکن بسا اوقات طرز تحریر میں بے احتیاطی اور انداز تقریر میں بے اعتدالی کے باعث غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور باہمی سوء ظن ان غلط فہمیوں کو ایک بھیانک شکل دے دیتا ہے۔ اگر تقریر وتحریر میں احتیاط واعتدال کا مسلک اختیار کیا جائے اور اس بدظنی کا قلع قمع کردیا جائے تو اکثر وبیشتر مسائل میں اختلاف ختم ہوجائے اور اگر چند امور میں اختلاف باقی رہ بھی جائے تو اس کی نوعیت ایسی نہیں ہوگی کہ دونوں فریق عصر حاضر کے سارے تقاضوں سے چشم پوشی کیے آستینیں چڑھائے، لٹھ لیے ایک دوسرے کی تکفیر میں عمریں برباد کرتے رہیں۔ ملت اسلامیہ کا جسم پہلے ہی اغیار کے چرکوں سے چھلنی ہوچکا ہے۔ ہمارا کام تو ان خونچکاں زخموں پر مرہم رکھنا ہے ان رستے ہوئے ناسور کو مندمل کرنا ہے اس کی ضائع شدہ توانائیوں کو واپس لانا ہے یہ کہاں کی دانش مندی اور عقیدت مندی ہے کہ ان زخموں پر نمک پاشی کرتے رہیں ان ناسوروں کو اور اذیت ناک اور تکلیف دہ بناتے رہیں'' (۴۷)

پیر صاحب نے ہمیشہ مذہبی فرقہ واریت اور لسانی گروہ بندی کی مذمت کی، وہ لسانیت پرستی کے بڑے مخالف تھے، یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ لسانیت پرستی کی وبا مذہبی لوگوں میں بھی پھیل رہی ہے، پیر صاحب کا تعلق پنجاب کے ایک دیہات سے تھا اس کے باوجود انہوں نے کبھی جاگ پنجابی جاگ کا نعرہ نہیں لگایا بلکہ پنجاب میں جن لوگوں نے لسانیت پرستی کو ہوا دی پیر صاحب نے ان لوگوں کی مخالفت کی وہ دیگر صوبوں سے تعلق رکھنے والے قوم پرست رہنماؤں کی اصلاح کی بھی کوشش کرتے رہے جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ پیر صاحب نے قومی زبان کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اسے علمی زبان قرار دیا اور علماء کو مشورہ دیا کہ وہ قومی زبان کی اہمیت کو نظر انداز نہ کریں انہوں نے قومی زبان کو علماء کی ترقی کی ضمانت قرار دیا (۴۸) اور قومی زبان کی ترقی کے لیے سعی کرتے رہے یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ کے فارغ

التحصیل علماء نے مختلف قدیم وجدید، عربی وفارسی کتابوں کا آسان اور سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

الغرض پیر صاحب حقیقی طور پر داعی اتحاد بین المسلمین تھے یہی ان کی شناخت ہی۔ اپنے ہوں یا بیگانے سب ہی نے ان سے عقیدت کا اظہار کیا اور ان کی اتحاد ملت اسلامیہ اور دین اسلام کے لیے کی گئی خدمات کو سراہا اس کا ثبوت مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے تاثرات ہیں جو پیر صاحب کے انتقال کے موقع پر مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے اس کے علاوہ متعدد مشاہیر کے تعزیتی پیغامات سجادہ نشین پیر محمد امین الحسنات کو بھی موصول ہوئے۔

پیر صاحب ۹/ذوالحجہ ۱۴۱۸ ہجری بمطابق ۷ اپریل ۱۹۹۸ء بروز منگل ۹ بجکر ۴۷ منٹ پر اسلام آباد کے اسلام آباد کمپلیکس ہاسپٹل میں دوران علاج انتقال کر گئے۔(۴۹) انتقال کے وقت پیر محمد کرم شاہ الازہری کی عمر قمری حساب سے بیاسی (۸۲) سال، دو (۲) ماہ، اٹھارہ (۱۸) دن اور شمسی حساب سے اناسی (۷۹) سال، دس (۱۰) ماہ، سات (۷) دن تھی۔

۲۰۰۱ء میں رئیس الجامعۃ الازہر مصر نے انگلینڈ کی جامعۃ الکرم میں پیر محمد امین الحسنات کو پیر صاحب کے لیے الدرع الفخری کا ایوارڈ پیش کیا عام طور پر یہ ایوارڈ ان افراد کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جو بقید حیات ہوں لیکن پیر محمد کرم شاہ وہ پہلی عالمی شخصیت ہیں جنہیں ان کے وصال کے بعد یہ اعزاز پیش کیا گیا یہ جامعۃ الازہر کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔(۵۰)

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مقالات (پیر محمد کرم شاہ الازہری) ج ۱، ص ۱۷، مرتبہ پروفیسر حافظ احمد بخش، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، مارچ ۱۹۹۸ء

۲۔ ماہنامہ کاروان قمر، کراچی (ضیاء الامت نمبر)، جنوری ۱۹۹۹ء، ص ۴۳

۳۔ شارب، ظہور الحسن، ڈاکٹر، تذکرہ اولیائے پاک وہند، ص ۱۶۱، ماہ اینڈ کمپنی، لاہور، س۔ن

۴۔ ہاشمی، حمید اللہ شاہ، احوال وآثار حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی، ص ۱۷، تصوف فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۰ء

۵۔ ایضاً، ص ۱۷

۶۔ ایضاً، ص ۱۷

۷۔ العسقلانی، ابن حجر، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (جلد ششم)، ص ۱۷۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت، (لبنان) س۔ن

۸۔ مقالات، جلد اول، ص ۱۷

۹۔ ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، (ضیاء الامت نمبر) اپریل/مئی ۱۹۹۹ء، ص ۴۳-۴۴

۱۰۔ احمد بخش، پروفیسر حافظ، جمال کرم، جلد اول، ص ۱۸۸، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، مارچ ۲۰۰۳ء

۱۱۔ ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور (ضیاء الامت نمبر) اپریل/مئی ۱۹۹۹ء، ص ۲۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۳۔ سہ ماہی ضیاء الاسلام، اسلام آباد (ضیاء الامت نمبر) اپریل تا جون ۲۰۰۱ء، ص ۸۶

۱۴۔ جمال کرم (جلد اول)، ص ۱۸۹

۱۵۔ ضیائے حرم، لاہور، اپریل/مئی ۱۹۹۹ء، ص ۳۱

۱۶۔ جمال کرم، جلد اول، ص ۱۹۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۱۹۔ ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور (ضیاء الامت نمبر)، ص ۳۳-۳۴

۲۰۔ مکتوب بنام پروفیسر حافظ احمد بخش، ۸ نومبر ۲۰۰۳ء

۲۱۔ مکتوب بنام نثار حسین خان ۱۸ نومبر ۲۰۰۳ء

۲۲۔ سہ ماہی ضیاء الاسلام، اسلام آباد، (ضیاء الامت نمبر) اپریل تا جون ۲۰۰۱ء، ص ۸۷

۲۳۔ جمال کرم، جلد اول، ص ۳۱۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۱۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۱۳

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۱۹

۲۷۔ راقم نے یہ بات حافظ صاحب سے بذریعہ ٹیلیفون یکم جنوری ۲۰۰۴ء کو معلوم کی تھی۔

۲۸۔ تفسیر ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۵۹۹

۲۹۔ سہ ماہی ضیاء الاسلام، اسلام آباد (ضیاء الامت نمبر) اپریل تا جون، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷-۱۸

۳۰۔ پیر صاحب شرعی عدالت کے جج اور ایڈہاک ممبر شریعت اپیلٹ بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان کے عہدہ پر

پر ناز ہے۔تفصیل کے لیے دیکھئے راقم کا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی بعنوان "پیر محمد کرم شاہ الازہری کی علمی ودینی خدمات"

۳۱۔پیر صاحب کے سوانح نگاروں نے پیر صاحب کے عدالتی مناصب پر متمکن رہنے کا دورانیہ تحریر کرنے میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔

۳۲۔ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، (ضیاء الامت نمبر) اپریل/مئی ۱۹۹۹ء، ص۴۰۹

۳۳۔اس بات کا اظہار صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے بروز یکم محرم الحرام ۱۳۹۹ھ بمطابق ۲ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔

۳۴۔تفصیل کے لیے دیکھئے پیر صاحب کا تحقیقی مقالہ "دعوت فکر و نظر (تین طلاقوں کا مسئلہ) شائع کردہ "انجمن یارسول اللہ (ٹرسٹ) شاہ فیصل کالونی کراچی، ۱۹۸۵ء۔

۳۵۔جمال کرم، جلد دوم، ص۵۴۷

۳۶۔سہ ماہی ضیاء الاسلام، اسلام آباد (ضیاء الامت نمبر)، ص۸۷

۳۷۔ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، اپریل/مئی ۱۹۹۹ء، ص۵۴۰

۳۸۔جمال کرم، جلد سوم، ص۴۲۸

۳۹۔جمال کرم، جلد سوم، ص۴۲۹

۴۰۔ماہنامہ کاروان قمر، کراچی، جنوری ۱۹۹۹ء، ص۳۰

۴۱۔انہوں نے ملفوظات ضیاء الامت اور ارشادات ضیاء الامت کے نام سے دو کتابیں مرتب کی ہیں اول الذکر کتاب میں پیر صاحب کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

۴۲۔ساجد، محمد اکرم، ملفوظات ضیاء الامت، ص۳۶، مکتبہ جمال کرم، لاہور، فروری ۲۰۰۳ء

۴۳۔ایضاً، ص۴۷

۴۴۔تفسیر ضیاء القرآن، جلد اول، ص۲۵۸

۴۵۔ایضاً

۴۶۔صدیقی کاندھلوی، اشفاق الرحمن، مولانا، علم حدیث ص۲۱۶، کتب خانہ شان اسلام، لاہور، اپریل ۱۹۷۷ء

۴۷۔تفسیر ضیاء القرآن، جلد اول، ص۲۵۸

۴۸۔جمال کرم، جلد اول، ص۳۱۳

۴۹۔جمال کرم جلد سوم، ص۲۱

۵۰۔جمال کرم جلد سوم، ص۴۲۸، ۴۲۹

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

مولانا ابوالحسن علی ندوی

عمیر احمد صدیقی

Islamic history witness that from the time of companions of Prophet (P.b.u.h) there are many dedicated Scholars who have been safeguard the Islam & Shariah and continuously repudiate the myths that were created by fundamentalist and fanatic group. These Scholars continuously reformed the wrong perception those were spread by uneducated Muslim and by anti muslim scholars. This is the result of such great people that Quran and Sunnah are in actual shape with its real soul & the face of Shariah is continuously glowing in front of the world. The One Commander of this great Convey is Moulana Syed Abul Hsan Ali Nadwi , Who defended the Islam with his vast knowledge and grip of knowledge among not only in Arabic & non Arabic's

but also in east and west. He awakened all the Muslims from their dark nap,
In this Article the undersigned tried to throw light on the different aspects of Moulana Syed Abul Hsan Ali Nadwi life with his brief intro and his services to Muslim Ummah.

مولانا علی میاں ایک نامور عالم دین، ایک بلند پایہ مصنف اور دانش ور، ایک صاحب طرز ادیب، ایک سحر انگیز خطیب اور ایک منفرد مؤرخ و سیرت نگار تھے، لیکن ان سب جہتوں سے بڑھ کر وہ ایک داعی، ایک مبلغ، ایک مصلح اور صاحب دل مزکی اور مربی تھے۔ ان تمام اوصاف کے اجتماع نے انہیں بیسویں صدی کے احیائے اسلام کے معماروں میں ایک منفرد مقام دے دیا تھا۔ مولانا کے پاس اقبال کا سوز و گداز، مولانا مودودی کی منطقیت اور تعقل، علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کا ذوق تاریخ اور مولانا تھانوی، مولانا محمد الیاس اور مولانا عبدالقادر رائے پوری کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ مولانا علی میاں کے یہاں یہ سب پہلو ایک دوسرے کے نقیض نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جسے علم و فن کے ناقدین نے نظر انداز کر دیا ہے۔

ولادت: ۶ محرم الحرام ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) بمقام: دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں، رائے بریلی۔ اتر پردیش۔ (۱)

تعلیم: تعلیم کا آغاز والدہ محترمہ نے قرآن مجید سے کیا پھر اردو اور عربی کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۳ء) میں والد صاحب حکیم سید عبدالحی صاحب کا انتقال ہوا، اس وقت آپ کی عمر نو سال سے کچھ اوپر تھی، تو تعلیم و تربیت کی ذمہ داری آپ کی والدہ محترمہ اور برادر بزرگ مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب پر آپڑی جو خود بھی اس وقت (دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد) میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھے۔ (۲)

☆ ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۴ء) میں علامہ خلیل عرب سے باقاعدہ عربی تعلیم کا آغاز کیا، اور اصلاً انہیں کی تربیت میں عربی زبان و ادب کی تعلیم مکمل کی۔ (۳) ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علامہ تقی الدین ہلالی کی آمد پر ان سے بھی خصوصی استفادہ کیا۔ (۴)

☆ ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۶ء منعقدہ کانپور میں برادر بزرگ کے ساتھ حاضری کا شرف حاصل ہوا، کم عمری میں عربی بول چال سے شرکائے اجلاس محظوظ ہوئے۔ اور بعض عرب مہمانوں نے اپنے گھومنے پھرنے میں بطور رہبر کم سن مترجم کو ساتھ رکھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا عبداللہ سورتی نے خاص طور پر اپنے کمرے میں بلا کر امتحاناً کچھ سوالات کئے۔ (۵)

☆ ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اس وقت مولانا یونیورسٹی کے سب سے کم سن طالب علم تھے۔ (۶) ۱۹۲۹ء میں یونیورسٹی سے فاضل ادب کی سند حاصل کی۔ (۷)

☆ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان انگریزی زبان سیکھنے پر بھی توجہ رہی، جس سے اسلامی موضوعات اور عربی تہذیب وغیرہ پر انگریزی کتابوں سے بھی براہ راست استفادہ کا موقع ملا۔ (۸)

☆ ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور علامہ محدث حیدر حسن خاں کے درس حدیث میں شریک ہوئے۔ اور ان سے صحیحین (بخاری و مسلم) اور سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی حرفاً حرفاً پڑھی اور اسی دوران انکے درس بیضاوی میں بھی شریک رہے مکمل دو سال تک ان کی صحبت میں رہ کر فن حدیث میں خصوصی استفادہ کیا۔ (۹)

تعلیمی اسفار:

☆ ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے کی خوشی میں اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ صاحب کی دعوت پر لاہور سفر کیا، جو دور دراز کا پہلا سفر تھا، جہاں لاہور کے علماء و خواص سے ملاقاتیں کیں، اور شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال سے شرف ملاقات حاصل کیا، جن کی نظم "چاند" کا اس سے قبل ہی عربی نثر میں ترجمہ کر چکے تھے۔ (۱۰)

☆ ۱۹۳۰ء میں لاہور کے دوسرے سفر کے موقع پر علامہ احمد علی لاہوری سے خصوصی وقت لے کر سورہ بقرہ کا ابتدائی حصہ پڑھا، اور ۱۹۳۱ء میں لاہور کے تیسرے سفر میں علامہ لاہوری سے حجۃ اللہ البالغہ پڑھی۔ (۱۱)

☆ ۱۹۳۱ء میں ہی علامہ لاہوری کے مشورہ سے حضرت خلیفہ غلام محمد بہاولپوری سے بیعت و ارادت کا تعلق قائم کیا۔ (۱۲)

☆ مولانا سید حسین احمد مدنی سے استفادہ کے لئے ۱۹۳۲ء بمطابق ۱۳۵۱ھ میں چند ماہ دارالعلوم دیوبند میں قیام کیا اور صحیح بخاری و سنن ترمذی کے اسباق میں شریک ہوئے، اور تفسیر و علوم قرآن میں خصوصی استفادہ کیا، (۱۳) نیز مولانا اعزاز علی صاحب سے فقہ اور قاری اصغر علی صاحب سے روایت حفص کے مطابق تجوید کا درس لیا۔ (۱۴)

☆ ۱۹۳۲ء بمطابق ۱۳۵۱ھ میں لاہور کے چوتھے سفر میں علامہ لاہوری سے ان کے مقرر کردہ نصاب برائے فضلائے مدارس عربیہ کے مطابق پورے قرآن مجید کی تفسیر پڑھی۔ (۱۵)

☆ ۱۹۳۲ء میں علامہ تقی الدین ہلالی صاحب کی معیت میں بنارس، اعظم گڑھ، مئو اور مبارک پور کا سفر کیا، اسی سفر میں علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری سے اوائل سن کر حدیث کی سند لی۔ (۱۶)

☆ ۱۹۳۳ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کی معیت میں کرنال، پانی پت، تھانیسر اور دہلی کا سفر کیا۔ (۱۷)

تدریسی و دعوتی زندگی:

۱۹۳۴ء میں ۲۰ سال کی عمر میں مولانا ندوہ میں عربی ادب اور تفسیر و حدیث کے استاد ہو گئے۔ (۱۸) منطق و تاریخ اسلامی کے دروس بھی ان کے پاس تھے۔ اسی زمانے میں ان کے بعض رفقائے درس بھی رفقائے تدریس تھے، جن میں قابل ذکر مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، شیخ محمد العربی اور بعد میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور مولانا ابواللیث ندوی (جو بعد میں امیر جماعت اسلامی ہند ہوئے) وغیرہ تھے۔ (۱۹) اسی سال رشتۂ ازدواج میں

منسلک ہوئے،(۲۰) اولاد کا غم البدل اللہ نے قابل رشک بھتیجے مولانا سید محمد الحسنیؒ (ایڈیٹر البعث الاسلامی) اور اصحاب علم وفضل بھانجوں (مولانا محمد ثانی حسنیؒ اور مولانا سید محمد رابع ندوی، ومولانا واضح رشید ندوی) کی صورت میں عطا فرمایا۔

۱۹۳۷ء میں مولانا مرحوم ایک مرتبہ پھر لاہور آئے، تو علامہ اقبال سے کئی گھنٹے ان کی ملاقات رہی، علامہ بیمار تھے اور ان کا ملازم خاص علی بخش آکر انہیں ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق زیادہ گفتگو سے منع کرتا تھا، مگر علامہ اقبال اسے اشارے سے واپس کر دیتے تھے۔ درحقیقت اصل اقبال کو مولانا مرحوم نے جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے، ۱۹۳۵ء میں "ضرب کلیم"، "بال جبریل"، "اسرار خودی"، "جاوید نامہ" وغیرہ، "بانگ درا" کے بعد کے دواوین پڑھنے کے بعد جانا، اور اقبال سے مولانا کی شیفتگی اور فکری وقلبی تعلق بہت بڑھ گیا۔ مولانا مرحوم کو علامہ اقبال کے سینکڑوں اشعار یاد تھے اور وہ طلبہ کے سامنے انہیں مناسب مواقع پر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے تھے، خاص طور پر وہ اشعار جن میں حضور رسالت مآب ﷺ کا ذکر یا ان کی طرف اشارہ ہے یا جن میں علامہ اقبال فرنگی فکر وتہذیب پر عالمانہ تنقید کرتے ہیں۔(۲۱)

۱۹۳۹ء کے لگ بھگ سید مودودی سے مولانا مرحوم کا تعلق قائم ہوا، انہی نے سید مودودی کو ندوہ آنے کی دعوت دی، جہاں سید مودودی نے اسلامی نظام تعلیم پر ایک اہم اور طویل لیکچر دیا، تین روز مہمان خانہ ندوہ میں سید مودودی مقیم رہے اور ندوہ کے طلبہ و اساتذہ سے ان کا تعارف ہوا۔ اس درمیان میں مولانا کا باقاعدہ جماعت اسلامی سے تعلق قائم ہوا اور وہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک لکھنؤ کی مقامی جماعت اسلامی کے امیر رہے۔(۲۲)

اس دوران مولانا مرحوم کا تعارف مولانا محمد الیاس کی دینی دعوت سے ہوا اور ان سے ذاتی ملاقاتیں بھی ہوئیں، مولانا ان کی ذاتی سیرت، انابت الی اللہ، اسلام کی اشاعت کے لئے ان کے دل میں صحابہؓ جیسی تڑپ اور ان کے زہد و ورع سے بہت متاثر ہوئے۔(۲۳) مولانا مرحوم کا رجحان ان کی طرف ہوا، اور وہ خود سید مودودی کے مشورے سے یکسو ہو کر مولانا محمد الیاس کی دعوت یا جماعت تبلیغ سے وابستہ ہو گئے،(۲۴) اور اسے انہوں نے ندوہ میں بھی عام

کیا۔ "مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت" نامی کتاب بھی تقسیم سے قبل مولانا نے تصنیف کی، مگر مولانا مرحوم نے جب اس کام یا دعوت کو پھیلایا تو اس کی چھ باتوں پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ قرآن و حدیث اور دینی کتابوں اور علماء سے علم و بصیرت دینی حاصل کرنے پر زور دیتے رہے، بعض دوسرے علماء یا ارکان جماعت اسلامی کے برعکس جو جماعت کو چھوڑ چکے تھے، مولانا مرحوم نے کبھی جماعت یا سید مودودی کے خلاف کوئی دشنام طرازی نہیں کی، اور اختلاف نظر کے باوجود سید مودودی کی وفات پر انہوں نے بہت اچھا اور طویل تعزیتی مضمون لکھا جو ان کی کتاب "پرانے چراغ" کی جلد دوم میں شامل ہے۔

مولانا مرحوم کو سید مودودی کی زندگی میں جب لاہور آنے کا موقع ملا تو سید مودودی سے ملتے رہے، اور آخر زمانے تک انہوں نے دوبارہ برطانیہ کے سفر میں لیسٹر کی اسلامک فاؤنڈیشن میں تقریریں کیں اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں پروفیسر خورشید احمد صاحب، خرم مراد صاحب مرحوم اور دیگر ارکان جماعت سے ملتے رہے۔ وہ تنگ نظری اور مذہبی تعصب سے کوسوں دور تھے، اگرچہ علمی طور پر انہوں نے سید مودودی کی بعض تحریروں سے اختلاف تحریری شکل میں کیا، لیکن یہ علماء کا شیوہ ہمیشہ سے رہا ہے۔

علمی ودعوتی زندگی:

مولانا کی علمی اور دعوتی زندگی پورے انہماک کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتی رہی اور دعوتی اسفار کی کثرت کے باوجود تصنیفی سرگرمی سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ جب انتہائی ضعف بصارت اور ایک آنکھ کے زیاں کے باعث مولانا لکھنے پڑھنے سے معذور تھے، تو اس اثناء میں بھی ان کا یہ تصنیفی شغل جاری رہا، مآخذ سے حوالوں کے لئے رجوع بعض معاونین کرتے اور اپنے ایک کاتب کو مولانا کتابیں املاء کراتے تھے۔ اسی دوران میں مولانا نے "السیرۃ النبویۃ" اور بعض دیگر کتب بھی تصنیف کیں۔

مولانا مرحوم خالص علمی و تحقیقی انداز میں مسلسل تصنیفی کام کرتے رہے، لیکن ان تحریروں کے اندر بھی داعیانہ روح کارفرما تھی۔ ۲۵ سال کی عمر میں "سیرت سید احمد شہید" کی جلد اول لکھنے کے بعد ۲۸ سال کی عمر میں مولانا نے ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ کی دعوت پر وہاں ایک

مبسوط علمی مقالہ پڑھا جو بعد میں "مذہب وتمدن" کے نام سے شائع ہوا، اس کے سامعین میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب جیسی وقیع علمی شخصیات شامل تھیں۔(۲۵)

۱۹۵۶ء میں مولانا نے کلیۃ الشریعۃ (شریعہ فیکلٹی) دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے دو ماہ وہاں اسلام کی اہم دینی وفکری شخصیات پر لیکچر دیے جو "رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں دمشق یونیورسٹی سے کتابی شکل میں چھپے،(۲۶) اس سے قبل مولانا "تاریخ دعوت وعزیمت" کی پہلی جلد لکھ چکے تھے جو دارالمصنفین سے چھپی تھی اور وہی دمشق یونیورسٹی کے لیکچروں کی بنیاد تھی، بعد میں یہ سلسلہ جاری رہا اور پانچ جلدوں میں مولانا نے یہ کتاب مکمل کی، "سیرت سید احمد شہید" کی دو جلدوں کو شامل کرنے سے یہ سلسلہ دعوت و عزیمت اپنی انتہا کو پہنچا۔ اس کتاب کی دوسری، چوتھی اور پانچویں جلد علی الترتیب تین عظیم ترین اسلامی شخصیات ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ پر ہیں، مولانا مرحوم کا یہ بڑا عظیم، منفرد اور مفید علمی کارنامہ ہے۔ یہ صرف علم رجال کی کتابیں یا سوانح حیات نہیں ہیں، بلکہ دعوت اسلامی کی دوسری صدی ہجری سے تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے اور سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد اس سلسلۂ ذہب کی آخری کڑی ہے۔

عربی زبان میں اگرچہ مولانا مرحوم سے قبل ڈاکٹر عبدالوہاب عزام علامہ اقبال پر ایک کتاب لکھ چکے تھے اور ان کے دیوان "ضرب کلیم" کا منظوم ترجمہ بھی کر چکے تھے، اسی طرح سے مصر کے نابینا شاعر صاوی شعلان نے حسن الاعظمی کی مدد سے ان کی متعدد نظموں اور غزلوں کا ترجمہ کیا تھا، لیکن اس سب کام سے اقبال کا صحیح اور جاندار تعارف عالم عرب میں نہیں ہوا تھا، پہلی بار ۱۹۵۱ء میں مولانا نے اپنے مصر کے سفر میں وہاں کلیہ دارالعلوم اور ایک دوسرے ادارے میں اقبال پر دو مبسوط لیکچر دیے،(۲۷) جن میں ان کی فکر ودانش کا جوہر پیش کیا اور یہ پہلے ایک مختصر کتاب "شاعر الاسلام اقبال" کے نام سے مصر میں چھپے، بعد میں مولانا مرحوم نے "مسجد قرطبہ" اور "ذوق وشوق" جیسی اقبال کی طویل نظموں اور دیگر نظموں کے انتہائی پرزور، ادبی

رعنائیت سے بھرپور اور مسحور کن تحریر میں ترجمے اس کتاب میں اضافہ کیے اور اس طرح "روائع اقبال" وجود میں آئی۔ اس کتاب سے روح اقبال عربوں میں منتقل ہوئی۔

مولانا مرحوم نے عصر حاضر کے بزرگ مشائخ کی جو سوانح عمریاں لکھی ہیں، وہ اپنی جگہ ایک علیحدہ تاریخی اور صوفیانہ کام ہے۔ یہ کتابیں مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا محمد الیاس، شاہ عبدالقادر رائے پوری اور مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی وغیرہ پر ہیں۔

ان کے علاوہ مولانا مرحوم کے متعدد سفرنامے ہیں، جو مشرق ومغرب میں مولانا کے سفر کی نہ صرف داستانیں اور روداد یں ہیں، بلکہ ان میں مولانا کا تنقیدی تجزیہ اور دعوتی پیغام بھی ہے۔ ان سفرناموں کا اہم مقصد وہاں موجود مسلمان نوجوان نسل کے عقائد اور تہذیبی قدروں کی حفاظت کرنا، اور ان میں مغربی اقدار و افکار کا ایمانی اور استدلالی طریقے پر مقابلہ کرنے کی استعداد پیدا کرنا تھا، اور ساتھ ہی مغرب کے اہل فکر کو اسلام کا آفاقی پیغام پہنچانا تھا۔

یہاں مولانا مرحوم کے تصنیفی کاموں کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس نکتے کی وضاحت کرنا ہے کہ مولانا کی تمام تصنیفات میں جو روح گردش کرتی ہے، وہ داعیانہ روح ہے، حتیٰ کہ ضخیم خالص علمی وتاریخی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" بھی اسی روح کی آئینہ دار ہے۔

ندوۃ العلماء کی نظامت

۱۹۶۱ء میں ان کے عزیز ومشفق بھائی فوت ہوئے تو مولانا مرحوم کے کندھوں پر ندوۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے بڑی بھاری ذمہ داری پڑ گئی۔(۲۸) ناظم کا کام دارالعلوم کو چلانا، اس کا مہتمم یا پرنسپل مقرر کرنا، اس کی تعلیمی سرگرمیوں پر نظر رکھنا، اس کی ترقی کی کوشش کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے لئے ضروری فنڈ پبلک کے تعاون سے مہیا کرنا تھا۔ مولانا مرحوم نے یہ کام بخوبی انجام دیے، ان کے عہد میں دارالعلوم نے جو ترقی کی، وہ اس سے قبل کسی ناظم کے عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ نصاب میں جذری (radical) اصلاحات کی گئیں، نئے شعبے یا کلیات — قرآنی علوم، عربی زبان وادب، دعوت اسلام و اعلام (میڈیا) کھولے، اور تحقیقی کام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا انتظام کیا گیا، گویا دارالعلوم صحیح معنوں میں مولانا مرحوم کے عہد میں ایک اسلامی یونیورسٹی بن گیا۔ اس کے علاوہ طالبات کی اسلامی اور دینی وعربی تعلیمات کے لئے

علیحدہ سے اسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔ مولانا ۱۹۵۱ء سے دارالعلوم ہی میں اس کے مہمان خانے میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ ان سب مصروفیات کے باوجود مولانا کے تصنیفی کاموں میں کوئی توقف یا کمی نہیں آئی۔ جب ہم ساٹھ کی دہائی سے مولانا مرحوم کے حجاز مقدس، خلیجی ممالک اور یورپ کے مسلسل سفروں کو دیکھتے ہیں تو حیرت اور بڑھ جاتی ہے کہ کس طرح مولانا بیسیوں کتابیں اور سیکڑوں تقاریر، خطبات اور رسائل لکھنے کا کام جاری رکھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کے وقت میں اہل اللہ کی طرح بڑی برکت عطا فرمائی تھی۔

مولانا علی میاں اور عالم عرب:

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے قبل مولانا نے پہلا حج والدہ کے ساتھ کیا اور چھ ماہ حرمین شریفین میں مقیم رہے، وہاں کے علماء سے ربط وضبط پیدا کیا اور اپنی زیر تصنیف کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کے لئے وہاں مزید معلومات عربی کتابوں اور مجلات سے جمع کیں اور اپنی اس کتاب کی اشاعت کی کوشش کی، لیکن یہ کتاب بعد میں یعنی ۱۹۵۰ء میں مصر کے ایک انتہائی مؤقر ادارہ نشر و اشاعت سے شائع ہوئی۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں مولانا نے حجاز سے اپنے دو قدیم ندوی شاگردوں کی معیت میں (جو سال بھر سے حجاز میں مقیم تھے) مصر کا بحری جہاز سے سفر کیا مصر میں پانچ ماہ مولانا کا قیام رہا، اس درمیان میں دس دن کے لئے سوڈان گئے۔ ۲۲ جون ۱۹۵۱ء کو مولانا بذریعہ طیارہ دمشق پہنچے، اور ۱۴ اگست تک مولانا کا قیام دمشق میں رہا، اس درمیان میں دوبارہ اردن بھی گئے اور فلسطین کے شہروں القدس، الخلیل وغیرہ بھی جانا ہوا۔ ملک عبداللہ شاہ اردن سے بھی ان کی دو ملاقاتیں ہوئیں، ان کے ساتھ کھانا کھایا، اور ۱۴ اگست ۱۹۵۱ء کو مولانا مرحوم کی واپسی بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ منورہ ہوئی۔

مولانا مرحوم کا مصر، سوڈان، شام، اردن اور لبنان کا یہ سفر انتہائی اہم تھا۔ ان کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" مصر میں ۱۹۵۰ء میں چھپ چکی تھی اور اس کے ذریعے اہل علم وتحقیق کے حلقوں اور دینی تنظیموں میں ان کا اجمالی تعارف ہو چکا

تھا۔ مصر میں اور پھر شام میں سارا عالم عرب اپنی تمام علمی بلندیوں اور مادی رعنائیوں کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ مولانا کی ملاقات تمام بڑی علمی و ادبی شخصیات سے ہوئی، یونیورسٹیوں میں اور ریڈیو پر، نیز بہت سی دینی و اجتماعی تنظیمات وتحریکات، اخوان المسلمین اور شبان المسلمین، قاہرہ یونیورسٹی میں ان کی تقریریں ہوئیں، اخوان تو ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ وہ مولانا کا اپنے ہی ایک مرشد کی طرح احترام کرنے لگے۔ اس سفر سے مولانا عالم عرب میں پوری طرح متعارف اور محترم المقام ہو گئے تھے۔ شام سے مولانا نے ایک مختصر سفر ترکی کا بھی بذریعہ ریل کیا تھا۔(۲۶)

عالم عرب کے لئے مولانا کی خدمات:

عالم عرب کے لئے مولانا کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے ساٹھ کی دہائی سے جمال عبدالناصر کے زمانے میں عرب قومیت کے خلاف بڑے پر زور طریقے سے عرب مجلات میں لکھا اور اپنی عربی اور اردو تقاریر میں برملا اس کی مخالفت کی، اور ناصر کے عرب اور ہندوستانی مریدین کی مخالفت اور تنقید کو برداشت کیا، دوسری خدمت اسلام پسند سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کے مسلمانوں کی یہ کی کہ انہوں نے یہاں کے حکمرانوں کی حد سے بڑھی ہوئی عیش وعشرت کی زندگی پر تنقید کی اور اسی طرح یورپ و امریکہ پر سیاسی و اقتصادی امور میں ان کے مکمل انحصار کی گرفت کی، مولانا مرحوم جس طرح الحاد اور روسی سوشلزم کے مخالف رہے، اسی طرح مغربی سرمایہ داری اور اس کی غیر اخلاقی اور حیوانی قدروں کے بھی مخالف رہے۔

رابطہ عالم اسلامی کی تشکیل:

۱۹۶۲ء میں جب "رابطہ عالم اسلامی" کی مکہ مکرمہ میں تشکیل ہوئی تو مولانا مرحوم اس کے رکن اساسی قرار پائے، اسی طرح اسی سال مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا اس کی کونسل کے رکن اساسی کی حیثیت سے لیے گئے، بعد میں "رابطہ عالم اسلامی" کی متعدد ذیلی تنظیمیں جیسے "المجمع الفقہی" (فقہ اکادمی) اور "المجلس الاعلیٰ للمساجد" قائم ہوئیں تو مولانا ان کے رکن منتخب کیے گئے، اب ان اداروں اور تنظیموں کے اجلاسوں کی وجہ سے سال میں تین چار مرتبہ حجاز مقدس جانے لگے، اور آخری دس برسوں میں نقرس کے مرض کے سبب وہیل

چیئر (wheel chair) پر منتقل کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہا۔

اسی حالت میں مولانا مرحوم نے ۱۹۹۶ء میں ایک بار استنبول، لندن اور امریکہ کا سفر بھی وہاں کی بعض اسلامی تنظیمات اور اوکسفرڈ کے اسلامک سینٹر کے اجلاس میں شرکت کے لیے کیا، اور اسی حالت میں استنبول کا چوتھا یا پانچواں سفر وہاں ۱۹۹۶ء میں سیمینار میں شرکت کے لئے کیا۔ ۱۹۹۷ء میں لاہور میں اپنے قائم کردہ "رابطہ عالم اسلامی" کے اجلاس میں تشریف لائے اور یہاں متعدد تقاریر، علاوہ "رابطہ عالم اسلامی" کے اجلاس کے، پنجاب یونیورسٹی وغیرہ میں کیں۔ ۱۹۹۹ء کے وسط میں فالج کا حملہ ہونے کے بعد، اور پھر اس سے تین چار ماہ بعد باوجود شدید کمزوری کے "کاروان زندگی" کی آخری ساتویں جلد املاء کرائی۔ (۳۰)

ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کی تنظیمی سرگرمیوں کے علاوہ مولانا مرحوم مختلف عالمی اور ہندوستان کی اسلامی تنظیموں سے بطور بانی وصدر وابستہ رہے تھے اور ان کی سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک تھے۔ اس ذیل میں مولانا مرحوم کے بیسیوں صدارتی خطبات اور تقاریر ہیں، جن میں سے بہت سی عربی اور اردو میں مطبوعہ اور بہت سی منتظر طبع ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے کوششیں:

ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے مولانا نے صرف نظر نہیں کیا، اگرچہ وہ سیاسی آدمی نہ تھے، لیکن انہوں نے جمعیت علماء ہند کے نڈر لیڈر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری کی وفات اور جمعیت کی سردمہری کے بعد پوری قوت سے مسلمانان ہند کے سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل میں ان کے حقوق کے دفاع کے لئے پوری سرگرمی سے کام کیا، اس کے لئے مولانا نے اپنے مخلص دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف تنظیمیں - "مسلم مجلس مشاورت"، "دینی تعلیمی کونسل"، "پیام انسانیت" اور "مسلم پرسنل لا بورڈ" - بنائیں اور ان میں سے اکثر کے وہ صدر رہے، ان تنظیموں اور خاص طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلے میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کی حفاظت کے لئے، اور ساتھ ہی مختلف فسادات میں مسلمانوں کے جانی و مالی نقصانات کے بعد ان کے تحفظ کے لئے اندرا گاندھی، راجیو گاندھی اور وی پی سنگھ وغیرہ سے ملاقاتیں کر کے اور انہیں خطوط لکھ کر ان کی توجہ اس طرف دلاتے رہے۔ پیام انسانیت کے متعدد آل انڈیا اور لوکل جلسوں

(مسلم و ہندو) اجتماعات میں خطاب کر کے وہ ہندوؤں کو بھی اسلام کا پیغام پہنچاتے رہے کہ اس میں ان کی اور ہندوستان کی خیریت ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کے شکوک وشبہات دور کرتے رہے۔ مولانا کی زندگی کا یہ عملی اور افادی پہلو بیرون ہند کے لوگوں سے بہت حد تک مخفی ہے یا غیر معلوم ہے۔

مولانا علی میاں اور پاکستان:

۱۹۷۸ء میں اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے ایک استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دور حاضر میں عالم اسلام کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھوے اور خرگوش کی تمثیل استعمال کی۔ روایتی کہانی میں خرگوش بہت تیز رفتار تھا اور کچھوا سست رفتار، لیکن خرگوش سو رہا اور کچھوا مسلسل محو سفر رہا جس کے نتیجے میں کچھوا اپنی اجباری سستی کے باوجود معرکہ جیت گیا تھا، مقابلہ آج بھی کچھوے اور خرگوش کا سا ہے، لیکن معاملہ یہ ہے کہ کچھوا اپنی سست رفتاری کے ساتھ سو بھی رہا ہے اور خرگوش اپنی تیز رفتاری کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

اس کچھوے کو گراں خوابی سے کون بیدار کرے گا؟۔ مولانا علی میاں کے خیال میں یہ فریضہ ملت اسلامیہ پاکستان کو انجام دینا ہے۔ (۳۱) مولانا علی میاں نے پاکستان کو تمام اسلامی دنیا کی روح قرار دیا اور کہا کہ عالم عرب او اسلامی ممالک میں زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ پاکستان عالم اسلام کی فکری راہ نمائی کا ذمہ دار ہے۔ پاکستان جس نظریے کا داعی اور علمبردار ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ ملک دنیا بھر میں اس نظریہ حیات کے ماننے والوں کے لئے ایک فصیل اور مثال کا کام دے۔ دنیا کے جس گوشے میں بھی اسلام اور مسلمانوں کو کوئی صدمہ پہنچے ان کی نگاہیں پاکستان کی طرف اٹھیں اور کبھی نامراد نہ لوٹیں، ماضی میں جو مقام سلطنت عثمانیہ کو حاصل تھا، مولانا علی میاں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اب وہی مقام پاکستان کو حاصل ہونا چاہیے۔ آج دنیا میں ایک بھی ایسا اسلامی ملک موجود نہیں جو مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے اپنا وزن ڈالے تو دنیا اس کا وزن محسوس کرے اور مسئلے کے حل پر مجبور ہو جائے۔ مولانا علی میاں کے خیال میں یہ کردار پاکستان کو ادا

کرنا چاہیے اور یہ مقام پاکستان کو حاصل ہونا چاہیے۔

اعزاز و تکریم:

☆ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں کلید بردار کعبہ شیخ شیبی صاحب نے دو روز مسلسل بیت اللہ شریف کا دروازہ کھول کر مولانا کو اجازت عام دے دی کہ مولانا جسے چاہیں خانۂ خدا میں بلا لیں۔ (۳۲)

☆ ۱۹۴۸ء میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز پر ندوۃ العلماء کے نائب معتمد تعلیم اور ۵۴ء میں علامہ کی وفات کے بعد بالاتفاق معتمد تعلیم منتخب ہوئے۔ (۳۳)

☆ ۱۹۵۶ء میں دمشق کی "مجمع اللغۃ العربیۃ" (اکیڈمی آف عربک لینگویج) کے مراسلاتی ممبر منتخب کیے گئے۔

☆ ۱۹۶۰ء میں دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کے قیام کے وقت سے تاحین حیات اس کے صدر رہے۔

☆ رابطۃ العالم الاسلامی کی تاسیس و قیام کا پہلا اجلاس جو ۱۹۶۲ء میں مکہ مکرمہ میں ہوا جس میں جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز اور لیبیا کے حاکم ادریس سنوسی بھی شریک تھے، اس اجلاس میں نظامت کے فرائض مولانا نے انجام دیے۔

☆ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی تاسیس و قیام کے وقت ۱۹۶۲ء سے اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر طے پائے اور اس کا نظام بدلنے تک برابر یہ منصب برقرار رہا۔

☆ ۱۹۶۳ء میں حج سے دو دن قبل حرم شریف میں مصلی شافعی کے اوپر منبر سے خطاب کا شرف حاصل ہوا۔

☆ ۱۳۸۲ھ، ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے۔

☆ رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (اسلامک یونیورسٹیز فیڈریشن۔ رباط، مراکش) کے اس تاسیس کے وقت سے ہی ممبر رہے۔

☆ ۱۹۸۰ء میں اردن کی مجمع اللغۃ العربیہ کے رکن بنائے گئے۔

☆ ۱۹۸۰ء میں اسلامی خدمات پر شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازے گئے۔

☆ ۱۹۸۱ء میں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ادب میں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازے گئے۔

☆ ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ کے اسلامک سنٹر کے قیام کے وقت سے اس کے صدر رہے۔

☆ جولائی ۱۹۸۳ء میں قاری محمد طیب صاحب کی وفات کے بعد بالاتفاق مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے، اور تاحیات اس پر فائز رہے۔

☆ ۱۹۸۴ء میں رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ (یونیورسل لیگ آف اسلامک لٹریچر) کے قیام کے ساتھ اس کے صدر قرار پائے۔

☆ ۱۹۹۶ء میں مولانا کی دعوتی و ادبی خدمات پر ترکی میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی کانفرنس کے موقع پر ایک سیمینار ہوا۔

☆ بروز ۱۸ شعبان ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۸/ دسمبر ۱۹۹۶ء کو کلید بردار کعبہ شیبی خاندان کے موجودہ جانشین نے بیت اللہ شریف سے منسلک سیڑھی پر دعوت دے کر کلید کعبہ در کعبہ پر رکھ کر دروازہ کھولنے کا اعزاز عطا کیا۔ اور بیت اللہ شریف کے اندر امیر مشعل بن محمد بن سعود آل سعود کی فرمائش پر دعا فرمائی جس میں رابطہ عالم اسلامی کے تمام اراکین اور ذمہ داران شریک رہے۔

☆ رمضان ۱۴۱۹ھ (جنوری ۱۹۹۹ء) میں دبئی میں عالمی حسن قرأت کے مقابلے کے موقع پر سال ۱۹۹۹ء کی "عظیم اسلامی شخصیت" کے وقیع ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔

☆ تاریخ اسلام کے جلیل القدر اصحاب دعوت و عزیمت کی مثالی سیرت نگاری پر ۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء) میں آکسفورڈ اسلامک سنٹر کی طرف سے "سلطان برونائی ایوارڈ" سے نوازے گئے۔ (۳۴)

مولانا کی تصنیفات و تالیفات:

☆ عربی میں سب سے پہلا مقالہ سید رشید رضا مصری کے مجلہ "المنار" میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا جو سید احمد شہید کی دعوت و تحریک جہاد سے متعلق تھا۔ جسے علامہ نے بعد میں الگ رسالہ کی شکل میں بھی شائع کیا، اس وقت مصنف کی عمر ۱۶ سال سے کچھ اوپر تھی۔

☆ اردو میں سب سے پہلی تصنیف ۱۹۳۸ء میں بعنوان "سیرت سید احمد شہید" شائع ہوئی، جو

متحدہ ہندوستان کے دینی و دعوتی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ مشائخ وقت اور مصلحین کبار نے خاص طور پر نوعمر مصنف کی بہت ہمت افزائی فرمائی۔

☆ ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بی-اے کے طلباء کے لئے اسلامیات کا نصاب مرتب کرنے کی دعوت دی اور آپ کا تیار کردہ نصاب پسند کیا گیا۔

☆ جامعہ ملیہ دہلی کی دعوت پر ۱۹۴۳ء میں جامعہ میں ایک لیکچر دیا جو بعد میں "مذہب اور تمدن" کے نام سے طبع ہوا۔

☆ ۱۹۴۰ء میں "مختارات من ادب العرب" ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۴ء کے درمیان "قصص النبیین" اور "القراءۃ الراشدۃ" کے سلسلے مکمل فرمائے۔ اول الذکر دونوں کتابیں بلاد عربیہ کے مختلف تعلیمی اداروں اور عربی زبان کے مراکز میں شامل نصاب ہیں۔

☆ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان اپنی مشہور عربی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) کی تالیف فرمائی، ۱۹۴۷ء کے پہلے سفر حج پر کتاب کا عربی مسودہ ساتھ تھا (جسے علماء حرم نے بنظر استحسان دیکھا اور مصنف کی ہمت افزائی فرمائی) جب کہ اس کا اردو ترجمہ ہندوستان میں شائع ہو چکا تھا۔

☆ ۱۹۵۸ء میں اپنے مرشد شیخ عبدالقادر رائے پوری کے حکم پر "قادیانیت تحلیل و تجزیہ" اور ۱۹۶۵ء میں "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش"، ۱۹۶۷ء میں "ارکان اربعہ"، ۱۹۸۰ء میں "دستور حیات"، ۱۹۸۴ء میں "اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں"، ۱۹۸۸ء میں "المرتضیٰ" تالیف فرمائی۔ ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۹ء میں اپنی خودنوشت سوانح "کاروان زندگی" کے سات حصے تحریر فرمائے۔

☆ ۱۹۶۳ء مطابق ۱۳۸۳ھ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں وزیٹنگ پروفیسر (استاذ زائر) کی حیثیت سے لیکچرز دیئے جو "النبوۃ والانبیاء" (منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین) کے نام سے شائع ہوئے۔ اسی سال حج سے صرف دو روز قبل بیت اللہ شریف کے بالمقابل مصلی شافعی کے اوپر حد نہ سے حجاج کو خطاب کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

☆ ۱۹۶۸ء میں سعودی وزیر تعلیم شیخ حسن بن عبداللہ آل الشیخ کی دعوت پر کلیۃ الشریعۃ ریاض

(جس نے بعد میں جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کی شکل اختیار کی) کے نصاب و نظام کی تیاری کے لئے ریاض تشریف لے گئے، اور اس موقع پر جامعۃ الریاض (موجودہ جامعۃ الملک سعود) اور کلیۃ المعلمین (ٹیچرز ٹریننگ کالج) میں تعلیم و تربیت کے موضوع پر کئی لیکچرز دیئے، جو علمی حلقوں میں پسند کئے گئے۔

☆ مولانا کی تصنیفی زبان عربی یا اردو ہے، اکثر اہم کتابیں اصلاً عربی میں ہیں جن کا اردو ترجمہ ہوا ہے۔ جبکہ بعض اہم کتابیں مثلاً "تاریخ دعوت و عزیمت" دوم تا پنجم اور "کاروان زندگی" وغیرہ اصلاً اردو میں ہیں جو عربی زبان میں منتقل کی گئی ہیں۔

☆ مولانا کی اہم تصانیف عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں، اردو میں مولانا کی کل تصانیف اور مطبوعہ رسائل کی تعداد (۲۹۰)، اور عربی تصانیف کی تعداد (۱۸۸) ہے۔ انگریزی میں شائع شدہ تصانیف (۶۰) اور ہندی میں ترجمہ شدہ کتابیں صرف (۴۸) ہیں۔

☆ قابل ذکر بات یہ ہے کہ متعدد اہم کتابیں ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۷ء کے درمیان اس عرصہ کی ہیں جب مولانا گلاکوما اور موتیابند کی وجہ سے خود پڑھنے لکھنے سے معذور تھے، اور دوسروں سے اخبارات اور کتابیں پڑھوا کر سنتے تھے۔(۳۵)

☆ مولانا کی اہم کتابوں کا ترجمہ فرانسیسی، فارسی، بنگالی، ترکی، ملیشین، گجراتی، تامل، ملیالم اور دیگر عالمی و علاقائی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ **صحافت:** ۱۹۳۲ء ندوۃ العلماء سے عربی میں نکلنے والے پرچے "الضیاء" کی ادارت میں اور ۱۹۴۰ء میں اردو پرچے "الندوۃ" کی ادارت میں شریک رہے، اور ۱۹۴۸ء میں انجمن تعلیمات اسلام کی طرف سے اردو میں "تعمیر" کے نام سے ایک پرچہ نکالنا شروع کیا۔(۳۶)

☆ ۱۹۵۸-۵۹ء میں مصر سے نکلنے والے پرچے "المسلمون" کے اداریے کی ذمہ داری آپ سے متعلق رہی، نیز استاذ محب الدین خطیب کے پرچے "الفتح" میں بھی بعض مقالات شائع ہوئے۔

☆ ۱۹۶۳ء میں لکھنؤ سے "ندائے ملت" اردو میں نکلنا شروع ہوا تو اس کی سرپرستی فرمائی، اور ندوہ سے ۱۹۵۵ء سے نکلنے والے عربی پرچے "البعث الاسلامی" اور ۱۹۵۹ء سے نکلنے والے عربی